بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے؟

مومن کیسے ہوتے ہیں

محترم پرویز صاحب کی تقریر

جس سے انہوں نے طلوع اسلام کنونشن منعقدہ نومبر ۱۹۶۴ء

کے کھلے اجلاس سے خطاب کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مومن کسے کہتے ہیں؟

قرآن کریم کی تعلیم انسان کو کیا بنا دیتی ہے، اس کی تفصیل میں جائیے تو کئی مجلدات درکار ہوں گی لیکن اگر اسے اجمالی طور پر بیان کرنا چاہیں تو اس سے بہتر جامع اور حسین انداز میں کچھ اور نہیں کہا جا سکتا جسے علامہ اقبالؒ نے اس ایک مصرعہ میں سمو دیا ہے کہ

آنچہ حق می خواہد، آں سازد ترا

قرآن کی تعلیم انسان کو وہ کچھ بنا دیتی ہے جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ یہ بن جائے۔ یعنی جس مقصد کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے، وہ مقصد پورا ہو جائے۔ اس کے سفرِ حیات کے لئے، اس صفحۂ ارض پر جو منزل مقرر کی گئی ہے، یہ اس منزل و منتہیٰ تک پہنچ جائے۔ انسان اور دیگر حیوانات کی تخلیق میں ایک بنیادی فرق ہے۔ دیکھئے ہر حیوان نے جو کچھ بننا ہوتا ہے وہ

انسان اور حیوان میں فرق

از خود وہ کچھ بن جاتا ہے۔ اس کے لئے اسے نہ کسی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، نہ سعی و کاوش کی حاجت۔ فطرت نے اس کے اندر جو کچھ بننے کے امکانات رکھے ہیں، وہ امکانات از خود بتدریج مشہود ہوتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ایک عمر تک پہنچ کر وہ حیوانی بچہ اپنی نوع کا مکمل فرد بن جاتا ہے ــــ شیر کا بچہ شیر بن جاتا ہے۔ بکری کا بچہ بکری۔ لیکن انسانی بچے میں فطرت نے جو مضمر صلاحیتیں رکھی ہوتی ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حیوانی یا طبیعی صلاحیتیں۔ یہ دیگر حیوانات کی طرح از خود نشو و نما پا کر ایک منتہیٰ تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور وہ بچہ بالآخر آدمی بن جاتا ہے۔ دوسری صلاحیتیں انسانی ہیں۔ یہ از خود نشو و نما نہیں پاتیں۔ انہیں مناسب تعلیم و تربیت سے نشو و نما دے کر اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کریم وہ پروگرام دیتا ہے جس سے ہر فرد کی وہ مضمر صلاحیتیں پوری پوری نشو و نما پا کر مشہود ہو جاتی ہیں اور پھر وہ انہیں ان مقاصد کے لئے صرف کرتا ہے جو اس کے لئے متعین کئے گئے ہیں۔ جب وہ اس مقام پر پہنچ جائے گا تو کہا جائے گا کہ انسان وہ کچھ بن گیا جو کچھ بننا

اس کے لئے مقصود و مطلوب تھا۔ قرآن نے ایسے فرد کو مردِ مومن کہہ کر پکارا ہے اور انسان کی اس ہیئت

مومن

کو احسنِ تقویم قرار دیا ہے (۹۵/۴)۔ یعنی ایسی ہیئت جو حسن و توازن میں انتہا تک پہنچ گئی ہو۔ جن خصوصیات کے مظہر یہ افراد ہوں انہیں صفاتِ مومنین کہا جاتا ہے۔ اور جب یہ خصوصیات، محسوس شکل میں سامنے آئیں تو انہیں اعمالِ صالحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ایسے کام جو اس فرد کی بھرپور انسانی صلاحیتوں کے اثمار و نتائج ہوں اور جن سے عالمِ انسانیت کے بگڑے ہوئے معاملات سنور جائیں۔ جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہو اسے قرآن نے خَیْرَ اُمَّۃٍ (۳/۱۰۹) "بہترین قوم جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے" قرار دیا ہے اور اُمَّۃً وَّسَطاً (۲/۱۴۳)۔ "یعنی ایسی قوم جسے عالمِ انسانیت میں مرکزی حیثیت حاصل ہو" کا مقام دیا ہے۔

سطحی نظر سے دیکھئے تو معاشرہ، جماعت یا اُمّت، افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہوتی ہے۔ لیکن اجتماعی نفسیات پر نگاہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ جماعت، افراد کی حاصل جمع (Sum-Total) کا نام نہیں ہوتی۔ اس کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس لئے قرآن، افراد کی خصوصیات کے علاوہ، جماعتِ مومنین کی خصوصیات کا ذکر بھی خاص طور پر کرتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ وہ افراد کی تعلیم، تربیت اور نشو و نما کے علاوہ ان اصول

اُمّت کی خصوصیات

و ضوابط کی بھی وضاحت کرتا ہے جن کے مطابق ان افراد نے اجتماعی امور سر انجام دینے ہوتے ہیں اور جن کی بنا پر وہ ایک منفرد جماعت بنتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآنی تعلیم کی انفرادیت اور بے مثالیت نکھر کر سامنے آتی ہے اور اسی مقام کے سامنے نہ ہونے سے، اچھے اچھے سمجھدار لوگوں کو بھی یہ دھوکا لگ جاتا ہے کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔" "عالمگیر سچائیوں" سے ان کی مراد ہوتی ہے عام اخلاقی اصول ـــــ مثلاً جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ کسی کو ستاؤ نہیں۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہی اخلاقی اصول قرآن پیش کرتا ہے اور یہی تعلیم دنیا کے دیگر مذاہب میں پائی جاتی ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔" لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جس اجتماعی نظام میں ان اخلاقی

نظام اور فرد

اصولوں کے حامل افراد زندگی بسر کرتے ہیں، اس نظام کے اصول کیا ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک برہمن جھوٹ نہیں بولتا۔ چوری نہیں کرتا۔ انسان تو ایک طرف، کیڑوں مکوڑوں تک کو بھی نہیں ستاتا۔ لیکن جس اجتماعی نظام کا وہ فرد ہے اس کا اصول یہ ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے انسان اور انسان میں اس قدر گہرا اور بنیادی فرق ہوتا ہے کہ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ ساری عمر دوسروں سے اپنی پرستش کراتا ہے اور شودر کے ہاں جنم لینے والا بچہ، تمام عمر دوسروں کی خدمت اور بیگار میں بسر کر دیتا ہے۔ اور

۱؎ ترجمان القرآن۔ ابوالکلام آزاد مرحوم۔

یہ فرق اس قدر غیر متبدل ہوتا ہے کہ شودر کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کے جوہرِ ذاتی اور اس کی ہزار محنت اور کوشش اس فرق کو مٹا نہیں سکتی۔ آپ کہئے کہ جو معاشرہ اس اجتماعی اصول کے مطابق متشکل ہو، اس میں افراد کی اس قسم کی "نیکیاں" کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے اور چوری نہیں کرتے، کیا خوشگوار نتائج پیدا کر سکتی ہیں؟ افراد کی اس قسم کی "نیکیاں" محدود سے انفرادی حلقہ میں قدرے سکون پیدا کر دیتی ہیں۔ لیکن نہ تو یہ انسان کو اس کا صحیح مقام دینے کے قابل بن سکتی ہیں اور نہ ہی عالمگیر انسانیت کی فوز و فلاح کا موجب۔ حتیٰ کہ یہ اُس باطل نظام کو تباہی سے بچا سکنے کے قابل بھی نہیں ہو سکتیں جس کے اندر وہ "نیک انسان" زندگی بسر کرتا ہے۔ یا مثلاً جس معاشرہ کا اصول یہ ہو کہ جو بچہ بنی اسرائیل (یہودیوں) کے ہاں پیدا نہ ہو، وہ نجات و سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس معاشرہ میں افراد کی اس قسم کی نیکیاں کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے اور چوری نہیں کرتے، عالمِ انسانیت کے کس کام آ سکتی ہیں؟ یا جس معاشرہ میں عقیدہ یہ ہو کہ ہر انسانی بچہ، پیدائشی طور پر گنہگار پیدا ہوتا ہے اور اس کے گناہوں کا یہ داغ "خدا کے بیٹے (حضرت مسیحؑ) کے کفارہ پر ایمان سے ہی دھل سکتا ہے۔ اس کے سوا اس داغ کے مٹنے کی کوئی صورت نہیں، اس معاشرہ میں لوگوں کا رحمدل۔ حلیم الطبع۔ اور منکسر المزاج ہونا، شرفِ انسانیت کی دلیل کیسے بن سکتا ہے؟ دنیا کے مذاہب سے الگ ہٹ کر دیکھئے اور سوچئے کہ کیا نظام ہائے کیمع ہیں۔ ایک بادشاہ کے لئے جو کروڑ

باطل کا نظام اور انفرادی نیکیاں

انسانوں پر اپنی مرضی چلاتا ہے یہ بات موجب فخر قرار پا سکتی ہے کہ اس نے ساری عمر تہجد قضا نہیں کی یا شراب نہیں پی؟ نظام سرمایہ داری میں، اگر ایک جاگیردار۔ زمیندار یا کارخانہ دار، جو ہزاروں محنت کش غریبوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سمیٹ کر لے جاتا ہے، یہ کہتا ہے کہ اس نے کبھی چوری نہیں کی، تو کیا اُسے نیک انسان کہا جا سکتا ہے؟ اگر ایک مذہبی پیشوا، جو دن رات عوام کو اس قسم کے عقائد کی تعلیم دیتا رہتا ہے کہ امیری اور غریبی انسان کی تقدیر سے وابستہ ہے جسے خود خدا نے مقرر کیا ہے اور خدا کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا، یہ کہتا ہے کہ اس نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کی یہ انفرادی نیکی، انسانیت کی اجتماعی میزان میں کوئی وزن رکھے گی؟ ان مثالوں سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جن انفرادی اخلاقی خوبیوں کو "عالمگیر سچائیاں" کہہ کر اسلام کو مذاہبِ عالم کی صف میں ہم دوش کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، غلط اجتماعی نظام میں ان کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ اصل یہ ہے کہ مذہب اور دین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مذہب، انفرادی ضابطۂ اخلاق کا علمبردار ہوتا ہے اجتماعی نظام سے اُسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، دین، اجتماعی نظام انسانیت کو سامنے رکھتا ہے اور افراد کی اخلاقی خوبیوں کو اس لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ اس سے اس معاشرہ کا توازن قائم رہے جو عالمگیر انسانیت کی سلامتی اور ارتقاء کا ضامن ہے، اور یوں انسان وہ کچھ بن جائے جو کچھ بن سکنے کا اس میں امکان ہے۔

قرآن کی جامع تعلیم

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ

(۱) جس معاشرہ میں افراد، عام اخلاقی ضوابط کی پابندی نہیں کرتے، اس معاشرہ میں کسی کو امن اور سکون نصیب نہیں ہو سکتا اور خود معاشرہ کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔

(۲) جس معاشرہ میں افراد عام اخلاقی ضوابط کے پابند ہوں، لیکن خود معاشرہ، غلط اجتماعی اصولوں پر متشکل ہو، اس میں عام معاشرتی روابط میں قدرے سکون حاصل ہو سکتا ہے لیکن نہ تو اس معاشرہ کی بنیادیں مستحکم ہوتی ہیں، اور نہ ہی اس کا وجود عالمگیر انسانیت کے لئے موجب رحمت بن سکتا ہے۔ اور

(۳) جس معاشرہ میں افراد، عام اخلاقی ضوابط کے پابند ہوں، اور خود معاشرہ بھی صحیح اجتماعی اصولوں کا علمبردار ہو، اس میں، افراد معاشرہ کو حقیقی امن و سکون میسر ہوتا ہے۔ ان کی طبیعی اور انسانی صلاحیتیں نشوونما پاکر برومند ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور اس کا وجود عالمگیر انسانیت کے لئے موجب فلاح و سعادت ہوتا ہے۔

قرآن کریم اسی قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے، جس میں افراد معاشرہ عام اخلاقی اصولوں کے شدت کے ساتھ پابند ہوں، اور جو معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہو، وہ ان مستقل اقدار کا حامل ہو جو عالمگیر انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جائے۔ اور یہ ہے قرآن کا وہ نظام جس کی مثال کسی اور جگہ نہیں مل سکتی۔ قرآنی تعلیم اپنی اس خصوصیتِ کبریٰ کی بنا پر بے مثل و منفرد ہے۔ قرآن میں مومنین کی ان انفرادی اور اجتماعی خصوصیات کا ذکر اس تفصیل، کثرت اور تکرار سے آیا ہے کہ اس سے افراد کی سیرت و کردار کا صحیح نقشہ اور جماعتِ مومنین (اسلامی معاشرہ) کا بین اور واضح تصور سامنے آجاتا ہے۔ اکثر مقامات پر ان انفرادی اور اجتماعی خصوصیات کا ذکر الگ الگ آیا ہے لیکن بعض مقامات پر یہ ایک دوسرے میں یوں سموئی ہوئی سامنے آتی ہیں جیسے ایک حسین و شاداب شجرِ طیب کہ اگر اس کی شاخوں، پتیوں، پھولوں اور شگوفوں کو دیکھا جائے تو پورے کا پورا درخت باعث شادابیٔ قلب و نظر ہو جائے اور اگر اس سرسبز و شاداب درخت پر بہ ہیئتِ مجموعی نگاہ ڈالی جائے تو اس کی تمام پھول پتیوں کی نزہت و نظافت روح نشاط در رگ جاں بن جائے۔ آئندہ سطور میں، ان افراد کی بعض نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے جنہیں قرآن مومن کہہ کر پکارتا ہے۔ اس مقصد کے لئے کہ ہم ان خصوصیات کی روشنی میں، اپنی سیرت و کردار پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ وہ کس حد تک ان کے آئینہ دار ہیں۔ اس لئے کہ جس طرح عرقِ گلاب اُسے کہا جائے گا جس میں گلاب کی خوشبو اور خصوصیات ہوں۔ اگر اس میں یہ صفات نہ ہوں تو وہ عرق گلاب نہیں ہوگا پانی کا پانی ہوگا خواہ اس بوتل پر کیسے ہی خوبصورت لیبل پر سنہرے حروف میں "عرق گلاب" کیوں نہ لکھا ہو۔ اسی طرح مومن وہ کہلائے گا جو مومن کی صفات کا حامل ہو۔ یہی وہ معیار ہے جس پر ہم اپنے مومن ہونے کے دعوے کو پرکھ سکتے ہیں۔ اور ان صفات کے تذکرہ سے یہی مقصود ہے۔

سب سے پہلے معاشرہ کے روزمرہ کے معاملات اور روابط کو لیجئے اور دیکھئے کہ قرآن کریم ان امور کو بھی کس قدر اہمیت دیتا ہے جنہیں عام طور پر قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا لیکن جن سے معاشرہ میں بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ جماعتِ مومنین سے تاکید کرتا ہے کہ

تمسخر نہ اڑاؤ

لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ (۴۹/۱۱)

کوئی جماعت، دوسری جماعت کا تمسخر نہ اڑائے۔

آپ جانتے ہیں کہ تمسخر، جسے ہمارے ہاں بڑا (LIGHTLY) لیا جاتا ہے، کتنے بڑے فساد کا موجب بن جاتا ہے۔ تمسخر درحقیقت ایک گہری نفسیاتی کیفیت کا مظاہرہ ہوتا ہے، جو نفرت۔ حسد۔ اور انتقام کے جذبات کی پیدا کردہ ہوتی ہے، لیکن اس شخص میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ ان جذبات کا اظہار کھلے بندوں کرے۔ وہ انہیں تمسخر کے فریب کارانہ پردوں میں چھپا کر پیش کرتا ہے۔ تمسخر کے نیز ترنشتر کی شکل وہ ہوتی ہے جسے کسی کا نام رکھنا کہتے ہیں۔ قرآن نے یہ کہہ کر اس سے بھی روک دیا کہ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ۔ (۴۹/۱۱)۔ ایک دوسرے کے برے برے نام مت رکھا کرو۔

(۲) اس کے بعد ہے

وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ (۴۹/۱۱)

اور آپس میں ایک دوسرے پر الزام مت لگاؤ۔

الزام تراشی

الزام تراشی کس قدر سنگین جرم ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ قرآن کی رُو سے زنا کی سزا سو کوڑے ہے اور پاک دامن عورتوں کے خلاف الزام تراشی کی سزا اسّی کوڑے۔ ہوتا یہ ہے کہ دوسرے پر الزام لگانے والا، خود تو معتبر بن جاتا ہے اور شریف مقابل کو خواہ مخواہ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا ہے کہ وہ اپنی بریت ثابت کرے۔ اس سے اور کچھ نہیں تو اکثر لوگوں کے دل میں اس شخص کے خلاف بدظنی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بھائی! بالآخر کچھ نہ کچھ بات تو ہوگی ہی جس سے یہ الزام لگایا گیا ہے!

نا نباشد چیزکے گویند مرداں چیزہا

بدظنی سے بچو

قرآن کریم نے ایک طرف الزام تراشی اور بہتان بافی کی اس قدر سخت سزا مقرر کی اور دوسری طرف جماعتِ مومنین سے تاکید کی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ (۴۹/۱۲)۔

اے جماعتِ مومنین! بدظنی سے بہت زیادہ بچو۔ یاد رکھو! بعض بدظنی بدترین گناہ تک پہنچ جاتی ہے۔

اسلامی معاشرہ کے افراد کے دلوں میں ایک دوسرے کے متعلق ہمیشہ خیر سگالی کے جذبات ہونے چاہئیں۔ لیکن جب دل میں کسی کے متعلق بدظنی پیدا ہو جاتی ہے، اس میں خیر سگالی کے جذبات باقی نہیں رہتے۔ اس کا علاج قرآن نے یہ بتایا ہے کہ (۱) ہر شخص کے متعلق تمہارا پہلا ردِ عمل (First Reaction) نیک ہونا چاہیئے اس کا ارشاد ہے کہ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا۔ (۴/۹۴)۔ جو تمہیں سلام کہے اس کے متعلق، یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔ اگرچہ یہ آیت، جنگ کے سلسلہ میں ایک اور اہم اصول کی وضاحت کرتی ہے لیکن جب اس کا اطلاق عام معاشرتی روابط پر کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہی ہو گا کہ (تحقیق سے پہلے) تمہارا پہلا ردِ عمل، ہمیشہ نیک ہونا چاہیئے۔ قرآن کے اسی حکم پر مبنی عدل کا یہ اہم اصول قائم ہوتا ہے کہ جب تک کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے اسے بے گناہ سمجھنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ جب کوئی شخص، تم سے

مومن کا پہلا ردِ عمل

کسی کے خلاف کوئی بات کہے تو تمہارا پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ ھٰذَاۤ اِفْکٌ مُّبِیْنٌ (۲۴/۱۲) یہ صریح جھوٹ ہے۔ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ (۲۴/۱۶)۔ یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ اپنے اندر (پہلا) ردِ عمل یہ پیدا کرو، اور پھر اس بات کا چرچا مت کرو (۲۴/۱۹)۔ اگر بات ایسی ہے کہ وہ بالبداہت غلط نظر آتی ہے تو اس کے متعلق خواہ مخواہ کی کرید مت کرو۔ وَلَا تَجَسَّسُوْا (۴۹/۱۲)، لیکن اگر

تحقیق کرو

اس کے متعلق کسی حتمی نتیجہ تک پہنچنا ضروری ہے تو اس کی تحقیق کرو۔ اس کے متعلق قرآن نے بڑی تاکید سے حکم دیا ہے جہاں کہا ہے کہ

وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ (۱۷/۳۶)

جس معاملہ کی تم خود تحقیق نہ کرو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت۔ بصارت۔ قلب (کان۔ آنکھ اور دل)، ہر ایک سے پوچھا جائے گا (کہ آیا تم نے ان سے کام لے کر اس معاملہ کی تحقیق کر لی تھی یا نہیں)۔

اور اگر معاملہ ایسا ہے جس کا اثر جماعتی زندگی پر بھی پڑتا ہے تو اسے متعلقہ حکام تک پہنچاؤ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (۴/۸۳) تاکہ وہ تحقیق کر کے بات کی تہ تک پہنچ جائیں (نیز ۴۹/۶)۔ اسی سلسلہ میں

غیبت مت کرو

قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا (۴۹/۱۲)۔ تم ایک دوسرے کی غیبت مت کرو۔ کسی کی پیٹھ پیچھے اس کے خلاف کوئی بات نہ کرو۔ جو بات کہنی ہو اس کے

سامنے کہو۔ اگر آپ سے کوئی شخص کسی کی غیر حاضری میں، اس کے خلاف کوئی بات کہتا ہے تو آپ کا فریضہ ہے کہ اس سے کہو کہ چلو، یہ بات اس شخص کے سامنے چل کر کرو۔ آپ دیکھیں گے کہ اس سے آپ کتنے بڑے فساد کا رخنہ بند کر دیتے ہیں۔

اذیّت مت پہنچاؤ کسی کے خلاف جھوٹے الزام لگانے، یا اس کی غیبت کرنے سے اُسے جس قدر قلبی اذیت پہنچ سکتی ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ مومن ایک دوسرے کے لئے قلبی سکون اور مسرت کا موجب ہونے چاہئیں، نہ کہ باعثِ اذیت و کوفت۔ اسی لئے فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ (۳۳/۵۸)۔

جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بلا جرم و خطا، ناحق اذیت پہنچاتے ہیں، تو وہ بہتان تراشی کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں اور کھلے ہوئے گناہ کا کام کرتے ہیں۔

اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (۴/۱۴۸)۔ اللہ اسے بھی پسند نہیں کرتا کہ تم خواہ مخواہ کسی کی بات کی تشہیر کرتے پھرو۔ ہاں اگر جو مظلوم ہو اسے اس کی اجازت ہے کہ وہ اپنے ظلم کے مداوا کے لئے داد فریاد کرے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم روزمرہ کی زندگی سے متعلق ان چھوٹی چھوٹی احتیاطی تدابیر سے کس طرح ایسی خرابیوں کا سدِّباب کر دیتا ہے، جو معاشرہ میں بہت بڑے فتنہ اور فساد کا موجب بن جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم، ان بظاہر، معمولی سی تدابیر پر عمل کرنا شروع کر دیں تو معاشرہ میں کس قدر امن اور سکون پیدا ہو جائے! لیکن قرآن، ان چیزوں پر بھی محض میکانکی طور پر عمل نہیں کراتا۔ وہ افراد کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس سے یہ تمام باتیں ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جماعت مومنین کے جنتی معاشرہ کے متعلق کہا ہے کہ وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (۷/۴۳)۔

دِل کا شفاف ہونا ان کے دل میں کوئی ایسی بات نہیں رہے گی جسے وہ دوسروں سے چھپا کر رکھنا چاہیں۔ آپ غور کیجئے کہ وہ معاشرہ فی الواقعہ کس قدر جنتی ہوگا جس میں افراد معاشرہ کے دل اس قدر آئینے کی طرح صاف اور شفاف ہوں کہ ان میں غبار اور کدورت کا نشان تک نہ ہو اور ہر ایک کا ظاہر و باطن یکساں طور پر سب کے سامنے ہو۔ اسی کو قرآن نے "دلوں میں باہمی الفت پیدا کرنے" سے تعبیر کیا ہے اور جماعتِ مومنین کو جس نعمتِ خداوندی کی یاد دلائی ہے وہ یہی باہمی الفت ہے۔ چنانچہ اس جماعت کو مخاطب کر کے

کہا گیا۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً۔ تم خدا کی اس نعمتِ کبریٰ کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ۔ خدا نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی اُلفت ڈال دی۔ اُلفت اس قسم کے

اُلفت اور اخوت

تعلق کو کہتے ہیں جس میں ایک دوسرے کے دل یوں باہمدگر مدغم ہو جائیں جس طرح بادل کا ایک ٹکڑہ دوسرے ٹکڑے کے اندر ضم ہو جاتا ہے — تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگرے — اس باہمی الفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔ تم اس نوازشِ خداوندی سے ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ تم اس سے پہلے، جہنم کے گڑھے کے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ بس اس میں گرنے ہی والے تھے کہ خدا نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۳/۱۰۳)۔ اس طرح اللہ اپنے احکام کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم جان لو کہ زندگی کا صحیح راستہ کونسا ہے۔ یہ "باہمی اُلفت" ایسی گراں بہا متاع اور نایاب جنس تھی، کہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا — کہ اگر تو چاہتا کہ ساری دنیا کی دولت خرچ کر کے ان کے دلوں میں ایسی الفت پیدا کر دے، تو بھی یہ ناممکن تھا (۸/۶۳)۔ یہ متاع باہر سے خرید کر دلوں میں داخل نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو دلوں کے اندر تبدیلی سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی یہ نتیجہ ہوتی ہے قرآن کے ساتھ وابستگی کا۔ اسی لئے، اسے قائم رکھنے کے لئے فرمایا کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲)۔ خدا کی اس رسّی کو سب مل کر

اعتصام بحبل اللہ

مضبوطی سے تھامے رہو اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو۔ یہی وہ رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے کے بعد کہا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹/۱۰)۔ مومن ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ بھائی بھی ایسے جن کی کیفیت یہ ہے کہ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹)۔ آپس میں ایک دوسرے کے بے حد ہمدرد اور غمگسار۔ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۵/۵۴)۔ ایک دوسرے کے سامنے جھکے ہوئے — جو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — لیکن اس نرمی کے یہ معنی نہیں کہ کوئی غلط کام کرے تو اُسے روکا بھی نہ جائے۔ قرآنِ کریم نے یہودیوں کی

برائی سے روکو

تباہی کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ (۵/۷۹)۔ وہ ایک دوسرے کو بُری باتوں سے روکتے نہیں تھے۔ جب جماعتِ مومنین کا عام فریضہ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے (۳/۱۰۳؛ ۹/۷۱) — یعنی دنیا کو ان باتوں کے کرنے کا حکم دینا جنہیں قرآن نے اچھا قرار دیا ہے اور ان امور سے روکنا جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ یہ جماعت دوسروں کو تو ایسا کہے گی لیکن خود اپنے معاشرے میں یہ کچھ نہیں کرے گی؟ وہ تو سب سے پہلے، ان امور کو خود اپنے ہاں عام کرے گی اور اس کے بعد انہیں دوسروں تک پھیلائے گی۔ اسی لئے جماعتِ مومنین کی خصوصیت یہ بتائی کہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳/۳)۔ وہ ایک دوسرے کو حق (قرآنی احکام و قوانین) کے ساتھ تمسک، اور استقامت پذیر رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور اس طرح باہمی اصلاح کرتے رہتے ہیں — اس لئے کہ وَاَصْلِحُوْا

ذَاتَ بَیْنِکُمْ (۸/۱)۔ ان کے خدا کا ارشاد ہے اور یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر سوء اتفاق سے ان کی دو جماعتوں میں کہیں لڑائی جھگڑا ہو جائے تو فَاَصْلِحُوْا بَیْنَہُمَا (۴۹/۹)۔ ان میں باہمی صلح

باہمی صلح کراؤ

کراؤ۔ اور اگر ان میں سے کوئی پارٹی سرکشی پر اتر آئے تو اُسے اس سے، بزور روکو۔ اور جب وہ اپنی اس روش سے باز آجائے تو ان دونوں میں عدل و انصاف کے مطابق صلح کرا دو۔

یہیں سے ہمارے سامنے، ایک اور اہم اصول آتا ہے اور وہ ہے توبہ۔ ایک شخص کا عام کردار اچھا ہے۔

توبہ کا مفہوم

لیکن کسی وقت اس سے نادانستہ کوئی غلط حرکت سرزد ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اُسے اس کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے کئے پر نادم ہوتا ہے۔ اگر اس کی اس غلط حرکت سے کسی کو اذیت یا نقصان پہنچا ہے تو اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور آئندہ کے لئے اس کی پوری پوری احتیاط برتتا ہے کہ کبھی اس قسم کی حرکت سرزد نہ ہو۔ اسے قرآن نے تَابَ وَ اَصْلَحَ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جس مقام سے غلط قدم اٹھا تھا، اس مقام پر واپس آجانا اور اس کے بعد اپنی ایسی اصلاح کرنا کہ پھر ایسی غلطی نہ ہو۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حرکت، نادانستہ۔ غلطی، سہو اور خطا سے سرزد ہوئی ہو۔ عمداً ایسا نہ کیا ہو۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (۴/۱۷)۔ توبہ ان کی ہے جس سے کوئی غلطی نادانستہ سرزد ہو جائے اور اس کے بعد وہ فوراً اس کی تلافی کر دے۔ اس میں نادانستہ (بِجَهَالَةٍ) اور فوراً (مِنْ قَرِيْبٍ) کے الفاظ غور طلب ہیں۔ یہی چیز قرآن کریم نے دیگر مقامات پر بھی بیان کی ہے (مثلاً ۱۶/۱۱۹ میں)۔

عمداً جرائم

اس کے برعکس، ایک شخص دیدہ دانستہ، عمداً۔ ارادۃً۔ غلط حرکات کا ارتکاب کرتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے۔ دوسروں کے خلاف جھوٹے الزام لگاتا ہے۔ غیبت کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور جب وہ کہیں گھر جاتا ہے۔ اپنی مدافعت کی کوئی شکل نہیں دیکھتا، تو کہہ دیتا ہے کہ مجھے معاف کر دو۔ تو اس کا نام توبہ نہیں۔ اس کے دیدہ و دانستہ ارتکاب نے یہ واضح کر دیا کہ یہ چیزیں اس کے کردار کا جزو بن چکی ہیں۔ یونہی نادانستہ سرزد نہیں ہوئیں۔ اس لئے، جب تک وہ اپنے کردار میں تبدیلی نہیں پیدا کرے گا، ان باتوں سے باز نہیں آسکے گا۔ وہ توبہ کرنے اور معافی مانگنے کے بعد بھی ایسا ہی کرتا رہے گا۔ اسی لئے قرآن نے وضاحت سے کہہ دیا کہ وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ (۴/۱۸)۔ توبہ ان لوگوں کی نہیں ہے جو بری حرکات کرتے رہتے ہیں تا آنکہ جب ان کے سامنے موت آکھڑی ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ میں توبہ کرتا ہوں ....۔ موت کے سامنے آجانے سے مفہوم یہ ہے کہ جب اُسے اس کا یقین ہو جائے کہ جو کچھ اس نے کیا ہے وہ بے نقاب ہو جائے گا اور وہ اس کے مؤاخذہ سے بچ نہیں سکتا تو پھر معافی مانگنے لگ جائے۔

یہ منافقت ہے اور بدترین کردار کی علامت۔ یہی وجہ ہے کہ جب فرعون ڈوبنے لگا اور اس نے کہا کہ میں خدا پر ایمان لاتا ہوں تو اس سے کہا گیا کہ اب ایمان سے کیا فائدہ؟ یہ بھی واضح ہے کہ ایسے شخص نے اپنی اس قسم کی حرکات سے جس شخص کو اذیت یا نقصان پہنچایا ہے، اگر وہ اسے معاف بھی کر دے تو اس سے اتنا ہی ہوگا کہ اس سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا۔ لیکن اس کی اصلاح تو اسی صورت میں ہو سکے گی جب وہ اپنے کردار میں خود تبدیلی پیدا کرے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے مغربی مفکر نٹشے نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

> جو برائی تم نے میرے ساتھ کی ہے اسے تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن جو برائی تم نے
> خود اپنی ذات کے خلاف کی ہے، اسے کون معاف کر سکتا ہے؟

اب آگے چلئے۔ مردِ مومن اپنے جوہرِ ذاتی اور بلندیٔ سیرت و کردار کی بنا پر اپنے اندر وزن رکھتا ہے اور یہ وزن ہر مقام پر اس کا توازن برقرار رکھتا ہے۔ لیکن جب انسان میں یہ خوبیاں نہ ہوں اور اس کا ایگو جھوٹی تسکین چاہے تو اس سے اس کے اندر نخوت اور پندار کے غلط جذبات ابھر آتے ہیں جس سے اس میں چھچھورا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن کی تعلیم

چھچھورا پن

مردِ مومن میں یہ چیز پیدا نہیں ہونے دیتی۔ چھچھورے پن کا مظاہرہ انسان کی گفتار، رفتار، چال ڈھال سے ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن اس کی تاکید کرتا ہے کہ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا (سورہ/آیت)۔ زمین پر یونہی اکڑ کر نہ چلو۔ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ (سورہ/آیت)۔ اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کرو۔ اسی طرح وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ

نخوت و تکبر

(سورہ/آیت)۔ اپنی آواز بھی نیچی رکھو۔ چلّا چلّا کر مت بولو۔ بیجا تکبر اور نخوت سے، لوگوں سے ترش روئی سے پیش نہ آؤ۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (سورہ/آیت) اس لئے کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (سورہ/آیت)۔ خدا، خود پسند، شیخی خورے انسان کو پسند نہیں کرتا۔ یہ مومنین کی نشانی نہیں ہے۔

مومن کی صفت یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں سے حسد نہیں کرتا۔ (...) بلکہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے اپنے اندر زیادہ سے زیادہ خوبیاں پیدا ہوں اور اس باب میں وہ دوسروں سے آگے نکل جائے۔ اس لئے کہ اس کے خدا کا حکم ہے کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (سورہ/آیت)۔ بھلائی کی باتوں میں ایک دوسرے سے بڑھ جاؤ۔ ان کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ (سورہ/آیت)۔ وہ ہر قسم کی لغویات سے پرہیز کرتے ہیں، اور اگر کہیں اتفاق سے اس قسم کی باتیں

حسد نہیں

ان کے سامنے آجائیں تو وہ ان سے دامن بچاتے ہوئے شریفانہ انداز سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا (سورہ/آیت)۔ ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ (سورہ/آیت)۔ ہر قسم کے مکر و فریب کی ملمع دار باتوں سے اجتناب کرو۔ قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا

صاف۔ سیدھی بات کرو

(سورہ/آیت)۔ ہمیشہ صاف۔ سیدھی۔ واضح۔ محکم دو ٹوک بات کرو۔ يَقُولُ الَّتِي

هِيَ اَحْسَنُ (۱۷/۵۳)۔ بڑے خوبصورت انداز سے اعتدال کے مطابق۔ اچھی اچھی باتیں کرو۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (۲/۴۲)۔ حق اور باطل۔ غلط اور صحیح۔ جھوٹ اور سچ کو آپس میں خلط ملط نہ کرو۔ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ (۲/۴۲)۔ نہ ہی حق کو چھپاؤ۔

عزۃ الاثم

انسان کے اندر ایک بدترین جذبہ ایسا ہے جو اس کی تمام خوبیوں کو تباہ کر دیتا ہے اور اسے کبھی صحیح راستے کی طرف آنے نہیں دیتا۔ یہ ہے اس کے ایگو کا جذبۂ پندار یعنی (FALSE PRESTIGE) کا احساس۔ اسے قرآن نے عزۃ الاثم کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ ایک شخص دل میں محسوس کرتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہے لیکن اس کے ایگو کا جذبۂ پندار اسے اس کے اعتراف پر آمادہ نہیں ہونے دیتا۔ وہ اس کے لئے اعذار بارده (JUSTIFICATORY REASONS) وضع کرتا ہے حالانکہ اس کا دل جانتا ہے کہ یہ دلائل جھوٹے اور یہ وجوہات وضعی ہیں۔ ایسے شخص پر سعادت کی راہیں کبھی نہیں کھل سکتیں۔ یہ چیز پارٹی بازی میں اکثر حق و صداقت کے راستے میں روک بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اپنی پارٹی کا فرد سرتاپا غلطی پر ہو، لیکن "پارٹی بازی" کا تقاضا ہے کہ آپ اس کی بہرحال تائید اور مدافعت کریں۔ ایک ڈاکو ہر روز مسافروں کے گلے کاٹے اور غریبوں کو لوٹے، اس کی پارٹی کے دوسرے ڈاکو اسے کبھی بُرا نہیں کہیں گے۔ لیکن اگر وہ لوٹ کے مال میں کچھ خورد بُرد کرے اور اس کی تقسیم منصفانہ نہ کرے، تو پھر پارٹی والے اسے بے ایمان اور بد دیانت قرار دیں گے۔ پارٹی بازی میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اپنی پارٹی کا آدمی جب تک دوسروں کے خلاف کچھ کرتا رہے اسے کبھی نہیں ٹوکا جاتا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اس سے رفتہ رفتہ اس کے دل کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اس میں کسی بات کو (ON MERITS) پرکھنے اور عدل و انصاف کی رو سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ یہ ہے وہ مسخ شدہ ذہنیت جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ۔ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو تو جھوٹی عزت کا احساس اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ (۲/۲۰۶)۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس کی انسانی صلاحیتیں جھلس کر راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔

مومن، نفس (ایگو) کے اس فریب میں نہیں آتا۔ یہ اس کے راستے میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ دامن جھٹک کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

اب مومنین کی مثبت صفات کی طرف آیئے۔ ان کے متعلق سورۃ المؤمنون میں کہا گیا ہے کہ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ (۲۳/۸)۔ یہ لوگ امانات کی حفاظت کرتے ہیں اور عہد کی پابندی۔

پابندیٔ عہد

حفظ امانت کے معنی یہی نہیں کہ جو چیز تمہارے پاس بطور امانت رکھی جائے اسے بحفاظت واپس کر دو۔

ہر وہ بات جسے کسی نے تم پر بھروسہ کر کے تمہارے سپرد کی ہے وہ امانت میں داخل ہے۔ خواہ وہ اس کا کوئی راز ہو یا اس کی عزت و آبرو کی رکھوالی۔ جہاں تک عہد و معاہدہ کا تعلق ہے' اس کے معنی یہی نہیں کہ جو اقرار نامہ کسی کو لکھ کر دو اس پر قائم رہو۔ اس میں ہر قسم کا وعدہ شامل ہے جو ایک انسان دوسرے سے کرتا ہے۔ یہ بڑی اہم صفت ہے۔ اور اس کی قرآن کریم نے بڑی شدت سے تاکید کی ہے۔ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۵/۱)۔ میں ہر قسم کا عہد اور وعدہ آجاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ وعدہ کے معنی کیا ہیں۔ آپ کسی سے کہتے ہیں کہ "بھائی! اس وقت مجھے جانے دو۔ میں ٹھیک چار بجے آجاؤں گا"۔ تو وہ آپ پر اعتماد کر کے آپ کی بات مان لیتا ہے۔ اگر آپ اپنے وعدے کے مطابق آتے نہیں تو آپ اپنا اعتماد کھو دیتے ہیں ــــ اور یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں بدترین قسم کا معاشرہ وہ ہوتا ہے جس میں کسی کو دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ نہ ہو۔ ایسے معاشرہ میں ہر شخص عدم اطمینان کے جہنم میں رہتا ہے۔ بعض لوگ تو وعدہ کرتے ہی منافقت سے ہیں۔ یعنی انہوں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا ہوتا ہے کہ انہوں نے وعدہ پورا نہیں کرنا۔ لیکن اکثر جذباتی (یا IMPULSIVE) لوگ' شدتِ جذبات میں آگے

جذباتی لوگ

بڑھ کر ایک وعدہ کر بیٹھتے ہیں اور اس کے بعد' جب جذبات کی شدت ماند پڑ جاتی ہے تو اس وعدہ سے پھر جانے کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ اس سے جو نقصان دوسروں کو پہنچتا ہے اسے تو چھوڑئیے۔ خود ایسے لوگوں کی سوسائٹی میں کوئی عزت نہیں رہتی۔ مومن کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ وہ وعدہ کرتا ہے تو سوچ سمجھ کر۔ اور جب وعدہ کر لیتا ہے تو پھر کچھ بھی کیوں نہ ہو' اسے پورا کرتا ہے ــــ بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۳/۷۵)۔ جو اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے اور یوں قانونِ خداوندی کی پاسداری کرتا ہے۔ تو یہی لوگ ہیں جو خدا کے نزدیک پسندیدہ اطوار و کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ لہٰذا' وعدہ شکنی' خواہ وہ شروع ہی میں بدنیتی کا نتیجہ ہو۔ یا بعد میں پھر جانے کی وجہ سے' اس فرد کو ذلیل اور معاشرہ کو تباہ کر دیتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے تاکیداً کہا ہے کہ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۴)۔ اپنے وعدہ کو ہمیشہ پورا کرو۔ اس کے متعلق تم سے پوچھا جائے گا۔ اور یہ پرسش تو اسی وقت شروع ہو جاتی ہے جب وعدہ خلافی کرنے والے کو ہر نگاہ حقارت اور نفرت سے دیکھنے لگتی ہے' خواہ وہ بظاہر کتنا ہی معتبر اور معزز کیوں نہ ہو۔

اب آگے بڑھئے۔ قرآن کریم نے مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (۳/۱۷) ہوتے ہیں یعنی ہمیشہ انصاف پر ڈٹ کر کھڑے رہنے والے۔ عدل و انصاف وہ بنیاد ہے' جس پر انسانی سیرت کی عمارت استوار ہوتی ہے اس لئے

عدل کے علمبردار

قرآن کریم اس باب میں مومنین کے سامنے ایسا بلند معیار رکھتا ہے جس پر پورا اترنے سے معاشرہ فی الواقعہ جنت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے ــــ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ ــــ اے ایمان والو! دنیا میں عدل و انصاف کے علمبردار بن کر رہو۔ اس باب میں کسی جذبے کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دو۔ یہ کچھ خالصتہً للہ کرو۔ اس مقصد کے لئے شہادت دینی پڑے تو اپنی

کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ بلکہ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ۔ اور سچی سچی گواہی دو۔ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ۔ خواہ وہ تمہارے اپنے ہی خلاف کیوں نہ جائے۔ اَوِ الْوَالِدَيْنِ — یا تمہارے والدین کے خلاف جائے۔ وَالْاَقْرَبِيْنَ — یا تمہارے دیگر رشتہ داروں کے خلاف — اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا — وہ دولتمند ہو یا غریب ہو۔ اس کا بھی تم پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ اس لئے کہ فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا — اللہ کا حق زیادہ ہے۔ اس لئے یاد رکھو۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا۔ تم اپنے جذبات کے پیچھے مت چلو۔ اس باب میں، اپنے قلبی رجحانات کو اثر انداز مت ہونے دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے جذبات تمہیں عدل کرنے سے روک دیں۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا۔ نہ ہی تم کوئی پیچدار۔ ذومعنی بات کرو۔ اَوْ تُعْرِضُوْا۔ نہ ہی اس سے اعراض برتو۔ پہلو تہی کرو۔ اس لئے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (4/135)۔ جو کچھ تم کرتے ہو خدا کو اس کی خبر ہوتی ہے۔ تم اس سے کچھ نہیں چھپا سکتے — یہ ہے عدل کا وہ معیار جو ایک مومن کے لئے مقرر کیا گیا ہے ذرا سوچئے کہ جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہو گا جو اس صفت کے حامل ہوں، اس معاشرہ کی کیفیت کیا ہوگی۔ اس میں یہ نہیں ہو گا کہ اپنی پارٹی کا آدمی ہے تو اس کے لئے میزان اور ہوگی اور دوسری پارٹی کے آدمی کے لئے اور — اس میں، تو دشمن سے بھی عدل کیا جائے گا۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ اِعْدِلُوْا۔ (5/8)۔ دیکھنا! ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ اُس سے بھی عدل کرو۔ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (5/8)۔ تقویٰ سے قریب ترین روش یہی ہے۔

عدل کے سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کی ایک شکل وہ ہے، جسے عدالتی عدل کہا جاتا ہے، یعنی لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرنا۔ اس کے متعلق قرآن کریم کا حکم ہے کہ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (4/58)۔ جب تم لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو، تو ہمیشہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ عدالتی عدل کے معنی یہ ہیں کہ فیصلہ قانون کے مطابق ہو۔ لیکن قرآن کریم

قانونِ عدل

اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ کیا جا رہا ہے، خود ہی عدل پر مبنی نہ ہو تو اس کی رُو سے کیا ہوا فیصلہ کس طرح مبنی بر عدل کہلا سکے گا۔ لہٰذا، جماعتِ مومنین کے متعلق قرآن کریم میں ہے اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (7/181)۔ یہ جماعت "الحق" کے مطابق لوگوں کی راہ نمائی کرتی ہے اور اسی (الحق) کے ساتھ عدل کرتی ہے۔ یعنی ان کے قوانین، الحق پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور انہی قوانین کے مطابق یہ لوگوں کے فیصلے کرتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ الحق، قرآن کریم ہے کیونکہ خود خدا کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (5/44)۔ جو لوگ معاملات کے فیصلے قرآن کے مطابق نہیں کرتے، سو وہی کافر ہیں۔

عدل کی دوسری شکل یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کا واجب حق ادا کر دیا جائے۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہ کی جائے۔ یہ وہ عدل ہے جو ہر شخص کی زندگی میں قدم قدم پر سامنے آتا ہے اور مومن اس میں ہر مقام پہ پورا اترتا ہے۔ آپ سوچئے

واجب حق

کہ جس معاشرہ میں ہر شخص کو اس کا حق، بلاکد و کاوش اور بلا پریشانی و تشویش ملتا چلا جائے، اس میں زندگی کس قدر خوشگوار گزرے گی۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے ایسے جامع الفاظ استعمال کئے ہیں جنہیں پھیلانے سے زندگی کا ہر گوشہ اس کے دائرے کے اندر آجاتا ہے۔ اس نے کہا ہے وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (۶/۱۵۳)۔ "ماپ اور تول کو عدل و انصاف کے ساتھ پورا کرو"۔ ماپ اور تول میں ہر قسم کے واجبات آجاتے ہیں۔

لیکن قرآن کریم عدل سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور اس کے ساتھ احسان کا حکم دیتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، عدل کے معنی ہیں جو کچھ کسی کا واجب ہے وہ ادا کر دینا۔ لیکن اگر اس سے دوسرے کی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو تو قرآن کی تاکید یہ ہے کہ اسے، اس کے واجب سے زیادہ دے کر اس کی کمی کو پورا کر دیا جائے۔ اسے احسان

احسان

کہتے ہیں جس کے معنی ہیں کسی کے بگڑتے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا اور اس طرح معاشرہ میں حسن پیدا کر دینا۔ اس "احسان" کی ابتدا، اپنے گرد و پیش سے کی جائے گی اور اس میں سرِ فہرست والدین کا نام آئے گا۔ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (۲/۸۳)۔ آپ حیوانات پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہاں، ماں باپ اپنے بچے

والدین سے احسان

کی پرورش تو کرتے ہیں لیکن بچے اپنے والدین کو پوچھتے تک نہیں۔ وہ انہیں جانتے پہچانتے بھی نہیں۔ یہ خصوصیت انسانی زندگی میں آکر پیدا ہوتی ہے کہ جب ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو اولاد ان کی خبرگیری کرے۔ والدین کے بعد دوسرے لوگ بھی اسی زمرے میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے وَ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ "یہی احسان دیگر اقربا سے بھی کرو۔ اور ان لوگوں سے بھی جو معاشرہ میں کسی وجہ سے تنہا رہ گئے ہوں۔ یا جو حرکت کے قابل نہ رہیں اور ان کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے۔ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ۔ نیز ہمسایہ سے بھی، خواہ وہ قریب کا ہو یا دور کا، اپنوں میں سے ہو یا بیگانوں میں سے۔ نیز اپنے رفقائے کار کے ساتھ بھی۔ اور ان مسافروں کے ساتھ بھی جن کے پاس زادِ راہ نہ رہا ہو، یا وہ ویسے ہی تمہارے حسنِ سلوک کے مستحق ہوں۔ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (۴/۳۶)۔ اور ان لوگوں کے ساتھ بھی جو تمہارے ماتحت کام کریں۔ ان سب کے ساتھ عدل کرو۔ ان کے حق میں کسی قسم کی کمی نہ کرو۔ اور اگر اس کے باوجود، ان میں کوئی کمی رہ جائے تو اس کمی کو بھی پورا کرو۔ اور اس کا دل میں خیال تک بھی نہ لاؤ کہ تم نے ان پر کوئی احسان کیا ہے، چہ جائیکہ اس احسان کی وجہ سے تم ان پر بارِ گراں بن جاؤ۔ اور انہیں خواہ مخواہ قلبی اور ذہنی اذیت پہنچاتے رہو۔ اس لئے کہ مومنین کا شعار یہ ہے کہ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى (۲/۲۶۲)۔ وہ کسی کو کچھ دے کر اس کے سر پر سوار نہیں ہو جاتے۔ سر پر سوار ہونا تو ایک طرف، وہ ان سے کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا

شُکُوۡرًا (۷۶/۹)۔ ہم تم سے اس کا بدلہ تو ایک طرف شکریہ تک کے بھی خواہاں نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ہَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ (۵۵/۶۰)۔ اس کمی کی وجہ سے تمہارا توازن بگڑ رہا تھا۔ ہم نے اس توازن کو برقرار کر دیا۔ بس یہی اس کا بدلہ ہے۔ دوسروں کی کمی کو پورا کرنے کے سلسلہ میں، وہ اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ یُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ وَلَوۡ کَانَ بِہِمۡ خَصَاصَۃٌ (۵۹/۹)۔ وہ تو تنگی میں گزارہ کر لیتے ہیں اور دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں۔

مقروض سے نرمی

یہ تو احسان کی صورت ہے جس میں کچھ واپس لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اگر کسی کو قرض دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مقروض کی حالت سقیم ہے تو اس پر سختی نہیں کرتے بلکہ اُسے اس وقت تک کی مہلت دیتے ہیں جب تک وہ آسانی سے قرض ادا کر دینے کے قابل نہ ہو جائے۔ اور اگر ایسا ہو کہ وہ قرضہ ادا کرنے کے قابل ہی نہیں رہا تو قرض معاف کر دیتے ہیں۔ وَ اِنۡ کَانَ ذُوۡ عُسۡرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیۡسَرَۃٍ ؕ وَ اَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (۲/۲۸۰)۔

ناحق مال نہ کھاؤ

ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی یہ خصوصیات ہوں وہ کسی کا مال ناحق کس طرح کھا جائیں گے اور جائز اور ناجائز کی تمیز کو کس طرح نظر انداز کر دیں گے۔ انہیں اس کی تاکید کی گئی ہے کہ لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَ تُدۡلُوۡا بِہَاۤ اِلَی الۡحُکَّامِ لِتَاۡکُلُوۡا فَرِیۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ النَّاسِ بِالۡاِثۡمِ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (۲/۱۸۸)۔ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق پر مت کھاؤ۔ یا اگر معاملہ عدالت تک پہنچ چکا ہے تو ایسا نہ کرو کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ کرا لو جس سے دوسروں کا کچھ مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے حالانکہ تم جانتے ہو کہ جو مال اس طرح حاصل کیا جائے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

حفاظت عصمت

یہاں تک ضبطِ نفس کی ان حدود کا ذکر آیا ہے جن کا تعلق مال و دولت سے ہے۔ اس کے بعد جنسی جذبات میں ضبط و تحدید کی صورت سامنے آتی ہے۔ اس باب میں مومن انتہائی پاکبازی کا مظہر ہوتے ہیں۔ ھُمۡ لِفُرُوۡجِہِمۡ حٰفِظُوۡنَ (۲۳/۵)۔ وہ اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں عصمت و عفت کا لفظ صرف عورت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس باب میں، مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ وہ مردوں سے بھی اسی طرح عصمت کا مطالبہ کرتا ہے جس طرح عورتوں سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مومنین، زنا تو خیر بہت دور کی بات ہے، فواحش (یعنی عام بے حیائی کی باتوں) کے بھی قریب تک نہیں پھٹکتے، خواہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی ہو یا پوشیدہ (وَ لَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَہَرَ مِنۡہَا وَ مَا بَطَنَ - (۶/۱۵۱)۔ خود بھی بچتے ہیں اور اس قسم کی تدابیر اختیار کرتے ہیں جن سے اس قسم کی باتیں معاشرہ میں پھیلنے نہ پائیں (۲۴/۱۹)۔ وہ اپنی نگاہوں کو

کبھی بے باک نہیں ہونے دیتے کیونکہ ان سے کہا گیا ہے کہ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (۲۴/۳۰) - اپنی نگاہوں کو بیباک مت ہونے دو۔ وہ جنسی بے راہ روی کے خیال تک کو اپنے دل میں نہیں آنے دیتے، اس لئے کہ ان کا ایمان ہے کہ یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹) - خدا نگاہ کی خیانت اور دل میں پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہے۔

خیالات کی پاکیزگی

علاوہ بریں، عام جذبات میں بھی ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ انہیں کبھی بے لگام اور حدود فراموش نہیں ہونے دیتے۔ اگر کبھی ان میں شدت پیدا بھی ہو تو وہ تخریب کی بجائے، ان کا رخ تعمیری کاموں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ اسی لئے مومنین کی خصوصیت کَاظِمِیْنَ الْغَيْظَ (۳/۱۳۳) بتائی گئی ہے۔ اس کے معنی "غصے کو دبا لینے والے" نہیں۔ اس کے معنی ہیں، اس زائد قوت کو تعمیری کاموں کی طرف منتقل کر دینے والے۔ اس کے بعد ہے وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ (۳/۱۳۳)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے مقامات پر یہ نہیں دیکھتے کہ دوسرے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں (تاکہ وہ بھی ویسا ہی برتاؤ ان کے ساتھ کریں)۔ وہ ان کے برتاؤ سے قطع نظر کر کے، دیکھتے یہ ہیں کہ انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق کیا کرنا چاہیئے۔ ان کے جذبات کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے۔

جذبات پر قابو

وہ انہیں ہمیشہ اپنے کنٹرول میں رکھتے ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ شیطان ان پر کبھی غلبہ نہیں پا سکتا۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲)۔ حتیٰ کہ اگر کبھی اس قسم کا کوئی خیال یونہی گھومتے پھرتے ان کے دل میں آجائے تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔ اور اس سے یوں ہوتا ہے گویا ایک دم روشنی ان کے سامنے آگئی اور انہوں نے صحیح راستہ اختیار کر لیا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (۷/۲۰۱)۔ زندگی کے ہر شعبے میں، قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھنا، یہ ہے وہ سب سے بڑی قوت جس سے مومنین، غلط باتوں کے ارتکاب سے مجتنب رہتے ہیں۔ اس کو ذکرِ اللہ کہتے ہیں۔ ان قوانین کی خلاف ورزی سے جو تباہیاں آتی ہیں، ان کا احساس انہیں لرزا دیتا ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ

خشیتِ قلبی

مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ جب قوانینِ خداوندی کا مجموعی تصور ان کے سامنے آتا ہے تو ان کی خلاف ورزی سے جو تباہی آتی ہے اس کے احساس سے ان کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۸/۲)۔ اور جب ان قوانین کی تفاصیل ان کے سامنے آتی ہیں تو ان پر عمل پیرا ہونے کے خوشگوار نتائج کے تصور سے ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔ اور وہ ان قوانین کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔ اور یہی وہ قوانینِ خداوندی پر اعتمادِ کلی اور یقینِ کامل ہے جس سے انہیں استقامت حاصل ہوتی ہے اور ان کے پاؤں میں کبھی لغزش نہیں آتی۔ اسی لئے انہیں الصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ (۳/۱۶) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی مستقل مزاج ... مناسبِ زندگی میں ہم آہنگ ہونے والے۔ اپنے

دعوائے ایمان کو اپنے اعمال سے سچ کر دکھانے والے۔ اور قوانین خداوندی کا پورا پورا اتباع کرنے والے۔ اپنی تمام توانائیوں کو ان کے مطابق صرف کرنے والے۔

جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ کبھی عقل و فکر سے عاری نہیں ہوتے اپنا دماغی توازن کبھی نہیں کھوتے۔ ہر معاملہ پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور و فکر کر کے صحیح نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے انہیں اُولُو الْاَلْبَاب (۳/۱۹۰)۔ کہہ کر پکارا ہے۔

صاحبانِ عقل و بصیرت

یعنی وہ صاحبان عقل و بصیرت يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جو کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کر کے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۹۰)۔ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس عظیم الشان کارگہ کائنات کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ ان کے عقل و فکر سے کام لینے کی کیفیت یہ ہے کہ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳)۔ اور تو اور جب ان کے سامنے ان کے رب کے احکام و قوانین پیش کئے جاتے ہیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔ انہیں غور و فکر سے قبول کرتے اور علم و بصیرت کی رو سے ان پر عمل کرتے ہیں۔ اس طرح وحی خداوندی پر ایمان لاتے ہیں اور پھر اپنے جذبات کو اس وحی کے تابع رکھتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰)۔ اس سے بڑھ کر راہ گم کردہ اور کون ہو سکتا ہے جو خدا کی راہ نمائی کے بغیر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے۔ یوں وحی خداوندی، علم و عقل اور جذبات کے حسین امتزاج سے مرد مومن کا قالب تیار ہوتا ہے۔

اقبالؒ کے الفاظ ہیں۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال — عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوز دروں

اور ظاہر ہے کہ جب مومنین تو کسی بات کو سوچے سمجھے بغیر قبول کرتے ہیں نہ تسلیم تو وہ دوسروں سے اپنی بات کس طرح دھاندلی سے منوا سکتے ہیں۔ وہ اپنے ہر دعوے کو دلیل و برہان کی رو سے پیش کرتے اور علم و بصیرت کی رو سے منواتے ہیں۔ چنانچہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ آپ اعلان کر دیجئے کہ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲/۱۰۸)۔

دلائل و براہین

میں تمہیں جو خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت ایسا کرتا ہوں۔ میں بھی یہی کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی ایسا ہی کریں گے۔ ہماری دعوت علم و بصیرت پر مبنی ہوگی۔ اسی لئے جماعت مومنین سے تاکید کی گئی کہ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۱۶/۱۲۵)۔ تم لوگوں کو اپنے رب کے راستے کی طرف اس انداز سے دعوت دو کہ ان کے

دل اور دماغ دونوں کی تسکین ہو جائے۔ وہ اسے ذہن اور قلب کی پوری رضامندی کے ساتھ مانیں۔ اور جو اعتراضات وہ پیش کریں ان کا جواب نہایت حسن کارانہ انداز سے دو۔ یونہی اندھا دھند مت جھگڑتے چلے جاؤ۔ فرعون جیسے سرکش اور متکبر کو بھی پہلے نرمی اور آشتی سے سمجھانے کی کوشش کرو۔ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ (۲۰/۴۴)۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح بات اس کی سمجھ میں آجائے اور وہ اپنی سرکشی کے تباہ کن نتائج سے ڈر جائے۔ لیکن اگر واسطہ ایسے لوگوں سے پڑ جائے جو اپنی ضد اور جہالت پر اڑے رہنا چاہیں اور کسی بات پر دھیان دینے کی کوشش ہی نہ کریں تو ان سے اعراض برتو۔ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (۷/۱۹۹)۔ لیکن اس کے باوجود ایسے موقعہ کی تلاش میں رہو کہ وہ بات سننے پر آمادہ ہوں تو ان تک پھر خدا کا پیغام پہنچاؤ۔ وَذَكِّرْ بِهِ أَن تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ (۶/۷۰)۔ تاکہ وہ اپنی غلط روی کے باعث قرآن کی راہ نمائی سے محروم نہ رہنے پائیں۔

اپنی اصلاح

لیکن دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ کہنے والا خود اپنی اصلاح کرے۔ جماعت مومنین کا یہی شیوہ ہوتا ہے۔ وہ پہلے خود عمل کرتے ہیں اور پھر دوسروں کو اس کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے خدا کا ارشاد ہے کہ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ. كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (۶۱/۲-۳)۔ تم وہ بات کیوں کہتے ہو جسے خود کر کے نہیں دکھاتے۔ اللہ کے نزدیک یہ انداز بڑا ناپسندیدہ ہے کہ تمہارے قول اور فعل میں تضاد ہو۔ ایسی نصیحت جس پر انسان خود عمل نہ کرے محض شاعری بن کر رہ جاتی ہے۔ اور اس قسم کی روش

شاعری مت کرو

مومن کا شعار زندگی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے قرآن میں آیا ہے کہ وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ (۳۶/۶۹)۔ ہم نے اپنے رسول کو شاعری نہیں سکھائی۔ شاعری اس کے شایانِ شان ہی نہ تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے شاعر اور مومن کو ایک دوسرے کی ضد بتایا ہے۔ چنانچہ سورۃ شعراء میں شاعروں کی یہ خصوصیات بتائی ہیں کہ وہ اپنے تصورات کی دنیا میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ کبھی اس وادی میں۔ کبھی اس بیابان میں۔ ایک ایسے اونٹ کی طرح جسے جھوٹی پیاس ادھر اُدھر لئے پھرے۔ اور ان کی ساری عمر باتیں کرنے میں گزر جاتی ہے عمل کے قریب وہ نہیں پھٹکتے۔ ان خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد کہا إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (۲۶/۲۲۷)۔ لیکن مومنین اس قسم کے نہیں ہوتے۔ وہ ابدی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے مطابق کام کر کے دکھاتے ہیں۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے جب شاعری کی مذمت کی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بات کلام موزوں میں پیش کرے تو وہ قابل مذمت ہے اور اگر وہ اسے نثر میں بیان کرے تو قرآن کی رُو سے مستحسن۔ بات نثر اور نظم کی نہیں بات اس ذہنیت کی ہے جسے قرآن نے شاعری سے تعبیر کیا ہے۔ اس ذہنیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے سامنے زندگی کا کوئی متعین مقصد اور نصب العین نہ ہو۔ وہ اپنے جذبات کی رو میں جو جی میں آئے کہتا چلا جائے اور جو کچھ کہے اس میں بھی تصنع اور بناوٹ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ وہ

ساری عمر باتیں کرتا رہے ان پر عمل کبھی نہ کرے۔ ذہنیت اس کی یہ ہو اور وہ اسے نواسنجی مرد شی سے تعبیر کرکے اپنے آپ کو صاحب وجدان قرار دے۔ یہ ہے وہ ذہنیت جسے مومن کی ذہنیت کی ضد قرار دیا گیا ہے، خواہ اس ذہنیت کا حامل نثر میں بات کرے یا نظم میں۔ مومن کے سامنے ایک متعین نصب العین حیات ہوتا ہے۔ اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ چھوٹی موٹی لغزشیں مومنین سے بھی ہو جاتی ہیں ——— معصوم عن الخطأ نہیں ہوتے ——— لیکن یہ لغزشیں ان سے سہو و خطا کی بنا پر نادانستہ سرزد ہوتی ہیں جن سے وہ فوراً تائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ بنیادی غلط روی سے ——— جسے قرآن نے کبائر سے تعبیر کیا ہے ——— ہمیشہ مجتنب رہتے ہیں۔

چھوٹی موٹی لغزشیں

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳/۳۲)۔ مومن وہ ہیں جو بنیادی غلط کاریوں اور بے حیائی کی باتوں سے ہمیشہ بچتے ہیں۔ ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ ان سے کبھی کبھار، نادانستہ کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو جائے۔ لہٰذا، مومن کا انداز یہ ہے کہ وہ جس بات کی دوسروں کو نصیحت کرتا ہے اس پر پہلے خود عمل کرتا ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کوئی شخص کسی کو اس کی غلطی پر ٹوکے تو وہ اُسے یہ کہہ کر جھڑک دے کہ میاں! پہلے اپنی اصلاح تو کرو۔ پھر دوسروں سے کہنا سننا! مومن کا یہ شعار نہیں۔ وہ کہنے والے کی بات کو توجہ سے سنتا ہے۔ پھر اپنا جائزہ لیتا ہے اور اگر دیکھتا ہے کہ اس میں واقعی وہ کمزوری موجود ہے تو اس کی اصلاح کر لیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اس اصول کو پیش نظر رکھتا ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے

اعتراض کی بجائے اصلاح

کہ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵/۱۰۵) تم اپنی اصلاح کی فکر کرو۔ اگر تم صحیح راستے پر جا رہے ہو، تو غلط راستے پر چلنے والا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے جو شخص تمہاری غلط روی پر ٹوکتا ہے اس کی بات سننے سے یہ کہہ کر انکار نہ کرو کہ جب تم خود اس پر عمل نہیں کرتے تو تمہیں دوسروں کو نصیحت کرنے کا کیا حق ہے؛ تمہیں تمہاری غلط روی کا نقصان پہنچے گا، اس کی غلط روی کا نہیں۔ اس لئے کہ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۴)۔ ہر شخص اپنی غلط روی کا خمیازہ خود بھگتے گا۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

لیکن اپنی اصلاح کرنے کے بعد، مومن کی یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ وہ ہر ایک پر اپنی نیکیوں کی دھونس جماتا رہتا ہے اور معاشرہ میں بڑا پاکباز بن کر اپنے آپ کو فریب دیتا اور دوسروں پر رعب گانٹھتا ہے۔ قطعاً نہیں۔ اس لئے کہ اس کے سامنے یہ اصول ہوتا ہے کہ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۚ هُوَ اَعْلَمُ

اپنی پاکبازی کی دھونس جماؤ

بِمَنِ اتَّقٰى (۵۳/۳۲)۔ یونہی اپنے آپ کو پاکباز نہ ٹھیراتے پھرو۔ اس کا فیصلہ میزانِ خداوندی کی رو سے ہوتا ہے کہ تم میں سے کون تقویٰ شعار ہے۔ مومن کا تو شعار یہ ہے کہ اس میں جس قدر زیادہ خوبیاں

پیدا ہوتی جاتی ہیں، وہ اسی قدر (شاخ ثمردار کی طرح) اور جھکتا چلا جاتا ہے۔ وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا (۲۵/۶۳)۔ اللہ کے بندوں کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے اندر جھوٹی تکبر پیدا نہیں ہونے دیتے۔ خوبیوں کا وزن انہیں اور جھکا دیتا ہے۔

لیکن جھکنے کے معنی یہ نہیں کہ وہ ہر ایک سے دبتے چلے جاتے ہیں۔ قطعاً نہیں۔ وہ جھکتے ہیں حق کے سامنے۔ لیکن

باطل کا مقابلہ کرتے ہیں

جو حق کی مخالفت کرتا اور اس سے سرکشی برتتا ہے، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جہاں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ کو رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ کہا گیا ہے (یعنی آپس میں، ایک دوسرے کے ساتھ، بڑی محبت اور نرمی سے سلوک کرنے والے) وہاں انہیں اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ (۴۸/۲۹) بھی قرار دیا گیا ہے۔ یعنی حق کی مخالفت کرنے والوں کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت۔ یعنی مومن کی کیفیت یہ ہے کہ

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

خود نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن میں ہے کہ یہ خدا کی رحمت ہے کہ آپ اس قدر نرم دل واقع ہوئے ہیں۔ اگر آپ سخت مزاج اور سنگدل ہوتے تو آپ کی جماعت کے افراد آپ سے الگ ہو جاتے" (۳/۱۵۸)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضورؐ سے تاکیداً کہا گیا کہ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ (۹/۷۳)۔ اے نبی! جو لوگ حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ یا جو تمہارے ساتھ رہتے ہوئے، منافقانہ روش اختیار کرتے ہیں، ان سے جہاد کرو۔ اور ان کے خلاف شدت اختیار کرو۔ یعنی جو لوگ کھلے بندوں حق کی مخالفت کریں اور سرکشی اختیار کریں۔ یا جو لوگ منافقت برتیں، ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ نہیں کیا جائے گا۔ ان کی مخالفت یا منافقت کو سختی سے روکا جائے گا۔ یاد رکھئے!

منافق کی مخالفت

مومنین کے معاشرہ میں، منافقین کا وجود — یعنی وہ لوگ جو بظاہر کچھ اور بات کریں اور ان کے دل میں کچھ اور ہو — ایک زہر آلود پھانس ہوتی ہے، جس کا علاج نہایت ضروری ہے۔ اس کے لئے اگر نوک نشتر کی بھی ضرورت پڑے تو اس میں بھی تامل نہیں کرنا چاہیئے۔ مومن کی نرم مزاجی کے یہ معنی نہیں کہ وہ منافقین کے سامنے بھی جھک کر رہتا ہے۔ ایسا کرنا تو خود منافقت اور مداہنت ہوگی۔ وہ منافق سے برملا کہہ دیتا ہے کہ تم منافقت برتتے ہو۔ ہم تمہارے دوست نہیں ہو سکتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دوسروں کو بھی اس کی منافقت سے آگاہ کرتا ہے تاکہ وہ کسی کو دھوکا نہ دے سکے۔ اس باب میں قرآن کی تعلیم بڑی واضح اور اس کی تاکید بڑی سخت ہے۔ اس لئے مومنین، حق کے مخالفین اور منافقین سے برملا کہہ دیتے ہیں کہ تمہارے ساتھ

ہمارا کوئی تعلق نہیں - تم ہمارے دوست اور رازدار نہیں ہو سکتے - سورۂ توبہ میں ہے -

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (۹/۲۳)-

اے جماعتِ مومنین! اگر تمہارے باپ اور بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں، تو انہیں اپنا دوست مت بناؤ- تم میں سے جو کوئی انہیں اپنا دوست رکھے گا تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو قوانین خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں-

اتنا ہی نہیں - عزیز سے عزیز دوست - قریب سے قریب رشتہ دار - بیوی بچے - مال و دولت - سامانِ زیست، متاعِ حیات - غرضیکہ دنیا کی کوئی چیز بھی، مومن کے نزدیک، ایمان اور اسلامی نظام کے مقابلہ میں عزیز نہیں ہو سکتی- یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ وجۂ جاذبیت ہیں- لیکن جب ان میں اور ایمان کے کسی تقاضے میں تصادم ہو، تو ان میں سے کسی شے کو بھی ایمانی تقاضے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ یہی ایمان کا تقاضا ہے اور مومنین کا شعار- ان کے خدا کا حکم یہ ہے کہ

ایمان کے معنی

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ - اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے ماں باپ - بہن بھائی - بیوی بچے - عزیز رشتہ دار - وہ مال و دولت جسے تم اتنی محنت سے کماتے ہو - وہ کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم خائف رہتے ہو اور وہ محلات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں - اگر ان میں سے کوئی چیز اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ - تمہیں خدا اور اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہو گئی - فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ " تو تم انتظار کرو - تا آنکہ خدا کا قانونِ مکافات تمہاری اس روش کا تباہ کن نتیجہ تمہارے سامنے لے آئے - تمہاری یہ روش مومنین کی روش نہیں - فاسقین کی ہے - وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○ (۹/۲۴) - اور خدا کا قانون یہ ہے کہ فاسقین پر — یعنی جو صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راہوں پر چل نکلیں - کبھی کامیابیوں کی راہ کشادہ نہیں ہوتی - مومن کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس نے اپنا مال اور جان، سب خدا کے ہاتھ بیچ دیئے ہوتے ہیں - جس دن وہ خدا پر ایمان لاتا ہے خدا اس کا اعلان کر دیتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ - یاد رکھو کہ اللہ نے مومنین کا جان اور مال جنت کے عوض خرید لیا ہے - ان کی کیفیت یہ ہے کہ

مال اور جان خدا کے

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ (۹/۱۱۱)- وہ خدا کی

راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پھر یا تو فاتح و منصور واپس لوٹتے ہیں۔ اور یا میدانِ جنگ میں جان دیدیتے ہیں۔ ان مومنین کی صفات یہ ہیں کہ اَلتَّائِبُوْنَ۔ سفرِ حیات میں وہ جہاں دیکھتے ہیں کہ ان کا قدم غلط راستے کی طرف اٹھ گیا ہے، وہ وہیں رک جاتے ہیں۔ اور جہاں سے قدم غلط اٹھا تھا وہاں واپس آکر صحیح راستے پر ہو لیتے ہیں۔ اَلْعَابِدُوْنَ۔ وہ قوانینِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں اَلْحَامِدُوْنَ۔ وہ انفس و آفاق کی ہر شے پر غور و فکر کرنے کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کارگہِ کائنات کی ایک ایک شے اپنے خالق کی حمد و ستائش کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اَلسَّائِحُوْنَ۔ وہ اس مقصد کے لئے دنیا بھر کا سفر کرتے ہیں۔ اَلرَّاکِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ۔ وہ ہمیشہ قانونِ خداوندی کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔ اور دل کے پورے جھکاؤ سے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وہ ان باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں قانونِ خداوندی صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکتے ہیں جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ وہ ان تمام حدود کی نگہداشت کرتے ہیں جنہیں قانونِ خداوندی نے متعین کیا ہے اور ان کے اندر رہتے ہوئے صحیح آزادی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۹/۱۱۲)۔ یہ ہیں وہ مومن جن کے لئے دنیا اور آخرت کی زندگی کی خوشگواریوں کی بشارتیں ہیں۔

مومنین کی صفات

یہ ہیں مختصر الفاظ میں، وہ صفات جن کے حامل انسان کو مومن کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ ان تمام صفات میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ قرآن کریم میں مومن کی کوئی ایک خصوصیت بھی ایسی نہیں جو صرف مردوں کے لئے مخصوص ہو اور اس میں عورتیں شامل نہ ہوں۔ اگرچہ خود لفظ "مومنین" کے اندر مرد اور عورتیں از خود شامل ہیں لیکن قرآن کریم نے ایک مقام پر مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ذکر اس طرح شانہ بشانہ کیا ہے کہ مصافِ زندگی میں دونوں ایک ہی صف میں، ساتھ ساتھ چلتے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ سورۂ احزاب کی آیت (۳۳/۳۵) کو دیکھئے۔ اس میں کس وضاحت اور صراحت سے کہا گیا ہے کہ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی تکمیلِ ذات کر سکتے ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (اَلْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ) اگر مرد اس پارٹی (جماعت) کے رکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمہ دار ہو تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رکن ہو سکتی ہیں (اَلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ)۔ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ ان کا استعمال صرف قانونِ خداوندی کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے (وَ الْقٰنِتِیْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ) اگر مرد اپنے دعوۓ ایمان کو اعمال سے سچ کر دکھانے کے اہل ہیں تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں (وَ الصّٰدِقِیْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ) اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رہ سکتی ہیں (وَ الصّٰبِرِیْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ) اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہو سکتے

مردوں اور عورتوں دونوں کی خصوصیات

ہیں کہ جوں جوں ان کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں وہ شاخ ثمردار کی طرح قانون خداوندی کی اطاعت میں اور جھکتے چلے جائیں تو یہی خصوصیت عورتوں میں بھی ہے۔ (وَالْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ) اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی ہے (وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ) اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ انہیں جہاں سے رد کا جائے وہ رُک جائیں، تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (وَ الصّٰٓئِمِيْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ)۔ اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں (وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ)۔ اگر مرد قانونِ خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور اسے ہر وقت پیش نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی اہلیت ہے (وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ) جب یہ صلاحیتیں دونوں میں موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ لہٰذا نظام خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجر عظیم موجود ہے (اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا)۔ سورۂ توبہ میں مومنین کی جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے (اور جنہیں پہلے بیان کیا جا چکا ہے) ان میں ایک صفت اَلسّٰٓائِحُوْنَ بھی ہے۔ یعنی دنیا کا سفر یا سیر و سیاحت کرنے والے۔ عورت کے متعلق جو نظریہ ہمارے ذہنوں میں راسخ ہے، اس کے پیش نظر خیال گزر سکتا تھا کہ کم از کم اس صفت میں مومن عورتیں شریک نہیں ہوں گی۔ قرآن کریم نے سٰٓئِحٰتٍ (۶۶/۵) کا ذکر خاص طور پر کر کے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا اور اس کی وضاحت کر دی کہ اس صفت میں بھی مومن عورتیں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔

یہ ہیں وہ صفات و خصائص جن کے حامل افراد سے قرآن وہ امت تشکیل کرتا ہے جو تمام عالم انسانیت میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳)۔ اس طرح ہم نے تمہیں ایک مرکزی امت بنا دیا۔ تاکہ تم عالم انسانیت کے اعمال کی نگرانی کرو (کہ وہ حق و انصاف پر قائم رہیں) اور تمہارا رسول تمہارے اعمال کی نگرانی کرے کہ تم نظام خداوندی کے مطابق چلتے رہو۔ دوسری جگہ ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ تم ایک بہترین قوم ہو جسے نوع انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے —— یہ بھلائی کیا ہے؟ یہ کہ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۰۹)۔ تم ان باتوں کا حکم دیتے ہو جنہیں وحی خداوندی مستحسن قرار دیتی ہے اور ان سے روکتے ہو جنہیں وہ ناپسندیدہ ٹھہراتی ہے۔ یعنی یہ لوگ (مومنین) پہلے اپنی زندگی وحی خداوندی کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ پھر ایک نظام قائم کرتے ہیں جس سے دوسرے لوگ بھی وحی کا اتباع کرتے جائیں۔ —— اسے قرآن کی اصطلاح میں نظام صلوٰۃ کہتے ہیں۔ اور مقصد اس تمام تگ و تاز سے یہ ہے کہ تمام افراد انسانیہ کو وہ ذرائع اور سامان میسر آتا رہے جس سے اس کے جسم اور ذات کی نشو و نما ہوتی چلی جائے۔

ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ یعنی نوعِ انسان کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں جماعتِ مومنین کے ان ہردو فرائض (ذمہ داریوں) کو بار بار دہرایا گیا ہے — وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (۵/۵۵)۔ حتیٰ کہ ان کی مملکت اور حکومت کی غرض و غایت بھی یہ بتائی گئی ہے۔ سورۂ حج میں ہے۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں ملک میں اختیار و اقتدار حاصل ہو گیا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم

اقامتِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ

کریں گے اور نوعِ انسان کی نشوونما کا انتظام کریں گے۔ ان باتوں کا حکم دیں گے جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکیں گے جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ اور ان کے تمام معاملات منشائے خداوندی کے مطابق طے ہوں گے۔ اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری نظر آتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ خیال عام کیا جاتا ہے کہ اسلام میں، عورتوں کو شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظریہ قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ جو آیت ابھی ابھی آپ کے سامنے آئی ہے اس میں اسلامی حکومت کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بتایا گیا ہے، اور دوسرے مقام پر اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ فریضہ مردوں اور عورتوں دونوں کا ہے۔ تنہا مردوں کا نہیں۔ سورۂ توبہ میں ہے۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ..... (۹/۷۱)۔ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ان کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

بہرحال، کہا یہ جا رہا تھا کہ جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے کہ وہ دنیا سے برائیوں کی روک تھام کا انتظام کریں گے۔ لیکن یہ روک تھام اندھی قوت کے استعمال سے نہیں ہو گی۔ وہ بھلائیوں کو اس قدر عام کرتے چلے جائیں گے کہ برائیاں خود بخود اپنی جگہ چھوڑتی جائیں۔ جس طرح تاریکی دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ روشنی لے آیئے۔ وَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (۱۳/۲۲)۔ البتہ جو لوگ نظامِ حق و صداقت کے خلاف سرکشی پر اتر آئیں اور ظلم و استبداد سے کسی طرح باز نہ آئیں، تو خلقِ خدا کو ان کے جور و ستم سے محفوظ رکھنے کے لئے، قوت کا استعمال بھی کریں گے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے

شمشیرِ مومن

لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا کہ وہ لوگوں کو علم و بصیرت کی رو سے حق کی دعوت دیں۔ پھر ان کے ساتھ ضوابطِ قانون بھی نازل کئے کہ دنیا میں عدل قائم رکھا جا سکے۔ لیکن جو لوگ نہ دلائل و براہین کی رو سے مانیں۔ نہ قانونِ عدل و انصاف کی پابندی اور احترام کریں تو ان کے لئے وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ (۵۷/۲۵)۔ ہم نے شمشیرِ خارا شگاف نازل کی۔ جماعتِ مومنین شمشیر کا استعمال مظلوم کی حمایت اور ظالم کے ظلم کی مدافعت کے لئے کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے اگر دنیا کی

کوئی اور قوم کسی قسم کی کوشش کرتی ہے تو جماعتِ مومنین ان کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ لیکن غلط کاموں میں کسی کے ساتھ تعاون نہیں کرتی۔ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ (۵/۲)۔

تعاون

ان کا شعار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (۴/۸۵)۔ جو کسی اچھے کام میں دوسرے کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کے خوشگوار نتائج میں اس کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اور جو کسی خراب کام میں کسی کا ساتھ دیتا ہے، تو اس کے مضر نتائج کی ذمہ داری اس پر بھی عائد ہوتی ہے۔

یہ ہیں وہ بلند مقاصدِ حیات جن کے لئے جماعتِ مومنین کے افراد ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے

ربط باہمی

زندگی کی متلاطم ندیوں کو مردانہ وار پار کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں تعلیم ہی یہ دی گئی ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا۔ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۳/۱۹۹) تم اپنے مسلک پر نہایت استقامت سے جمے رہو اور ایک دوسرے کی استقامت کا موجب بنو۔ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر رہو۔ اور ہر قدم پر قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یہی وہ روش ہے جس سے تمہیں سفرِ حیات میں کامیابی حاصل ہوگی۔ اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر، كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۶۱/۴) گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے کہ حوادثِ زمانہ کی سرکش موجیں اس سے آکر ٹکرائیں تو اپنا سر پھوڑ کر پیچھے ہٹ جائیں۔ ان کے اس ارتباطِ باہمی اور باہمد گر پیوستگی کا ذریعہ، تمسک بالقرآن (خدا کی کتاب کے ساتھ وابستگی) ہوتا ہے کہ ان سے کہا گیا ہے کہ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲)۔ تم خدا کی کتاب کے ساتھ سب کے سب مل کر پوری مضبوطی سے وابستہ رہو۔ اور آپس میں تفرقہ پیدا مت کرو۔ اس لئے کہ باہمی تفرقہ — امت کا فرقوں میں بٹ جانا — توحید نہیں شرک ہے۔ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۲)۔ دیکھنا! تم کہیں (اسلام لانے کے بعد پھر) مشرک نہ بن جانا۔

تفرقہ شرک ہے

یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن گئے۔ اس سے کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ بس حق پر ہوں (اور باقی سب باطل پر ہیں)۔ اور یوں امت کی اجتماعیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس وحدت اور استقامت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان پر رحمتوں کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ جو انہیں دنیا اور آخرت میں زندگی کی خوشگواریوں کی بشارتیں دیتے ہیں۔ اِنَّ

نزولِ ملائکہ

الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ یہ واقعہ ہے کہ جو لوگ اس حقیقت پر ایمان لاتے ہیں کہ ہمارا نشو و نما دینے والا اللہ ہے۔ اور پھر اس دعویٰ پر جم کر کھڑے

ہو جاتے ہیں- ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں جو ان سے کہتے ہیں کہ تم نہ کسی قسم کا خوف کھاؤ- نہ افسردہ خاطر ہو- اور اس جنتی زندگی کی خوشخبری لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا- نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ - ہم دنیا میں بھی تمہارے رفیق اور ساتھی ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی- وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ - (۴۱/۳۰-۳۱)- تمہیں دنیا اور آخرت میں، جو تمہارا جی چاہے گا ملے گا- جو مانگو گے، پاؤ گے- ہر قسم کی سربلندیاں اور سرفرازیاں تمہارے حصے میں آئیں گی- اور یہ سب تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوں گی- تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۷/۴۳)- یہ وہ جنت ہے جس کے تم، اپنے اعمال کی وجہ سے، مالک بنائے گئے ہو-

یہ ہیں وہ خصوصیات جن کے حامل انسانوں کو مومن کہا گیا ہے- انہیں زندگی کی جن خوشگواریوں اور سربلندیوں کی بشارت دی گئی ہے، وہ انہی خصوصیات کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں- محض مومن کہلانے اور مسلمان نام رکھا لینے سے یہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے- لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ (۴/۱۲۳)- یہ نتائج نہ تمہاری خوش فہمیوں سے حاصل ہو سکتے ہیں نہ ان اہل کتاب کی خالی تمناؤں سے- یہ تو صرف ان خصوصیات کے پیدا کرنے سے حاصل ہوں گے جنہیں مومنین کی صفات کہہ کر پکارا گیا ہے- حتیٰ کہ اگر کسی میں یہ خصوصیات موجود نہ ہوں، اور وہ نماز روزہ- حج- زکوٰۃ جیسے "دینی اعمال" پر بھی میکانکی طور پر کاربند ہو، تو بھی یہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے- قرآن نے

نیکی کا صحیح مفہوم

نہایت واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ- نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف- وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ- اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ تم ان بلند حقیقتوں پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھو جنہیں اجزائے ایمان کہا گیا ہے ــــ یعنی خدا اور اس کے قانون مکافات پر ایمان- زندگی کے تسلسل پر ایمان- وحی کی رُو سے دیئے ہوئے ضابطۂ قوانین پر ایمان- انبیاء اور ملائکہ پر ایمان ــــ نیکی اس کی ہے جو ان حقیقتوں پر یقین محکم رکھے اور اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ- اور پھر مال و دولت کی محبت کے باوجود اسے دوسروں کی پرورش کے لئے دیدے- وہ رشتے دار ہوں یا ایسے لوگ جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں- یا وہ لوگ جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے یا ان میں کام کاج کی استعداد نہ رہے- یا ایسے مسافر جو زادِ سفر سے محروم رہ جائیں- یا وہ لوگ جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہو- یا وہ دوسروں کے پنجۂ استبداد میں گرفتار ہوں- ان مقاصد کے لئے مال و دولت کا وقف کر دینا- یہ نیکی ہے- مختصر الفاظ میں نیکی یہ ہے کہ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ- ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں تمام افراد و معاشرہ قوانینِ خداوندی

اتباع کریں اور نوع انسان کی پرورش کا سامان مہیا کیا جائے۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ نیکی ان کی ہے جو اپنے عہد و پیمان کا احترام کریں اور قول اقرار کے سچے ہوں۔ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اور جب مشکلات کا سامنا ہو تو نہایت ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کریں۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (۲/۱۷۷) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعویٰ ایمان کو اپنے اعمال سے سچا ثابت کر دکھاتے ہیں۔ اور یہی ہیں وہ جو متقی کہلانے کے مستحق ہیں۔ نہ وہ جو محض رسمی طور پر نماز روزہ کی پابندی کرکے اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم پکے مومن ہیں اور بڑے نیک کام کر رہے ہیں۔ یہی نہیں۔ بلکہ ایسے خیراتی کام جنہیں عام طور پر "کارِ خیر" سمجھا جاتا ہے، وہ بھی نظام خداوندی کے قیام کے لئے جد و جہد کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ سورۂ توبہ میں ہے اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے

خیرات کے کام

سبیلیں لگا دینے والا یا خانہ کعبہ کی زیبائش و آرائش اور آبادکاری کے کاموں میں حصہ لینے والا، اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو خدا اور اس کے قانونِ مکافات اور حیاتِ اخروی پر ایمان رکھے اور نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے مسلسل جد و جہد کرتا ہے! تم اپنی خوش عقیدگی کی بنا پر کچھ ہی کیوں نہ سمجھو۔ لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ میزانِ خداوندی میں، یہ دونوں کبھی ہم وزن نہیں ہو سکتے۔ ایسا سمجھنا بڑی زیادتی ہے۔ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (۹/۱۹)۔ اور خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ اس قسم کی زیادتی کرنے والوں پر کامیابی کی راہیں کبھی نہیں کھلا کرتیں۔ یہودیوں کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ اسی قسم کی خود فریبی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے معاشرہ کا نظام ایسا قائم کر رکھا تھا جس میں معاشرہ کے کمزور، غریب، ناتواں افراد، اپنا گھر بار چھوڑ کر باہر نکل جانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ جب وہ اس طرح باہر نکل کر غیر محفوظ ہو جاتے اور دوسروں کے چنگل میں پھنس جاتے تو پھر وہی ابنائے وطن جن کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے، خیرات کے پیسوں سے ان کا فدیہ ادا کرتے اور سمجھتے کہ ہم بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْکُمْ اِخْرَاجُهُمْ (۲/۸۵)۔ حالانکہ ایسا نظام قائم کرنا جس میں معاشرہ کے غریب اور کمزور افراد، مظلومیت کا شکار ہو جائیں، ایسا جرم عظیم ہے جس کا کفارہ اس قسم کے خیرات کے کام کبھی نہیں بن سکتے۔ جماعتِ مومنین اس قسم کی خود فریبی کا شکار نہیں ہوتی۔ وہ نظام ایسا قائم کرتے ہیں جس میں اس قسم کے انفرادی خیراتی کاموں کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ قرآن تسلیم کرتا ہے کہ اہل کتاب میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو انفرادی طور پر دیانتدار ہیں لیکن اس کے باوجود وہ انہیں نظامِ خداوندی کی طرف آنے کے لئے دعوت دیتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا نظامِ معاشرہ اس قسم کا ہوتا ہے جس میں ان کی انفرادی نیکیاں خوشگوار نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ دیکھئے۔ قرآن اس حقیقت کو کیسے واضح اور بلیغ انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

وَ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْهِ قَآئِمًا ؕ ان اہل کتاب میں وہ بھی ہے جس کے پاس اگر چاندی سونے کا ڈھیر بھی بطور امانت رکھ دیا جائے تو وہ اسے جوں کا توں واپس کر دے۔ اور ایسا بھی کہ اگر اس پر ایک روپے کا بھی اعتماد کر دو تو وہ اسے کبھی واپس نہ کرے بجز اس کے کہ تم اس کے سر پہ ڈنڈا لے کر سوار رہو۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ ۚ یہ اس لئے کہ ان کا نظامِ معاشرہ قومی عصبیت کی بنیادوں پر قائم ہے جس میں یہ عقیدہ دل کی گہرائیوں میں راسخ کر دیا جاتا ہے کہ تم دوسری اقوام کے لوگوں کے ساتھ جو جی میں آئے کرو۔ اس سے تم پر کوئی الزام نہیں ہوگا۔ اور تماشا یہ کہ ان کے مذہبی پیشوا انہیں یہ بتلاتے ہیں کہ یہ شریعت خداوندی کے عین مطابق ہے حالانکہ وَ یَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝ (۳/۷۵)۔ یہ خدا کے خلاف صریح کذب وافترا ہے اور ایسا کہنے والے خوب جانتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے۔

قرآن کریم نے مثال تو یہودیوں کی دی ہے کہ وہ ایسا معاشرہ قائم کرتے تھے جس میں ان کے کمزور اور غریب بھائی گھروں سے بے گھر ہونے پر مجبور ہو جائیں اور اس طرح جب وہ دوسروں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے تھے تو انہیں چھڑانے کے لئے فنڈ اکٹھا کرتے تھے اور اسے بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے۔ لیکن اس سے اس نے اصول بہت بلند پیش کیا ہے۔ یعنی ایسا معاشرہ قائم کرنا جس میں غریب لوگ محتاج سے محتاج تر ہوتے جائیں اور اس کے بعد ان کی طرف خیرات کے چند ٹکے پھینک کر یہ سمجھنا کہ ہم نے بڑا ثواب کا کام کیا ہے جرمِ عظیم ہے فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِ...... (۲/۸۵)۔ جو قوم بھی ایسا کرے گی اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوگی اور آخرت میں بھی سخت عذاب کی مستحق۔

مومن اور مسلم کا فرق

بہر حال، یہ ہیں وہ خصوصیات جن کے حاملین کو مومن کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے مومن اور مسلم کے الفاظ اکثر مقامات پر ہم معنی استعمال کئے ہیں۔ لیکن ایک جگہ ایسی تشریح بھی کی گئی ہے جس سے، بعض گوشوں میں، ان دونوں کا فرق سامنے آجاتا ہے۔ سورۂ حجرات میں ہے۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ یہ بدوی قبائل، جو اسلامی مملکت کے قیام کے بعد مسلمان ہو گئے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا۔ ان سے کہو کہ یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لائے اور اس طرح مومن بن گئے ہیں۔ بلکہ یہ کہو کہ ہم اس مملکت کے سامنے جھک گئے ہیں وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ابھی تک ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔...... اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ

وَ رَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَ اَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ (۴۹/۱۵)۔ مومن کہلانے کے مستحق وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر دل کی کامل رضامندی سے ایمان لاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں کسی قسم کے شک و شبہ کا گزر تک نہیں ہوتا۔ پھر وہ، اپنی جان اور مال سے، خدا کی راہ میں جہاد کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہیں وہ جو اپنے دعوئے ایمان میں سچے ہوتے ہیں۔

اس سے ہمارے سامنے مسلم اور مومن کا فرق آجاتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ مسلم وہ ہے جس سے احکام خداوندی کی اطاعت، قانون کے ذریعے کرائی جاتی ہے، اور ان احکام کی اطاعت کا جذبہ جس کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے، اسے مومن کہتے ہیں۔ مومن کی ذات (PERSONALITY) کی نشوونما اس طرح ہو جاتی ہے کہ وہ تمام صفات خصوصیات جن کا ذکر گزشتہ اوراق میں کیا گیا ہے، اس کے مختلف گوشے (FACETS) بن جاتے ہیں، اس لئے وہ ان صفات کا فطری مظہر ہوتا ہے جس طرح سورج، روشنی اور حرارت کا فطری مظہر ہے۔ اسلامی معاشرہ کے اندر مسلم ان قوانین کی اطاعت سے رفتہ رفتہ ان اثرات کو اپنے دل میں جذب کرتا جاتا ہے، اور یوں اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ تا آنکہ وہ بھی مقام مومن تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے جہاں اعراب سے کہا گیا ہے کہ وہ ابھی اپنے آپ کو مومن نہ کہیں کیونکہ ہنوز ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا، وہاں ان سے یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ وَ اِنْ تُطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (۴۹/۱۴)۔ اگر تم نظام خداوندی کی اطاعت کرتے جاؤ گے تو تمہارے اعمال میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائیگی۔ ان کے نتائج مرتب ہوتے چلے جائیں گے۔ اس طرح تخریبی عناصر سے تمہاری ذات کی حفاظت ہو جائے گی اور اس کی نشوونما کا سامان بھی تمہیں ملتا جائے گا۔ بشرطیکہ تم نے یہ اطاعت، محض رسمی طور پر دی۔ ورنہ مسلم کے مسلم ہی رہو گے۔ مومن نہیں بن سکو گے۔

نفسیاتی تبدیلی

اسلامی نظام درحقیقت، اس تبدیلی کے خارجی اثرات کا نام ہے جو جماعت مومنین کے قلب میں پیدا ہوتی ہے۔ اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کے بغیر نظام خداوندی متشکل ہی نہیں ہو سکتا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (۱۳/۱۱)— یعنی خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک اس قوم کے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو جائے —— یہ ایسی سنت اللہ (خدا کا اٹل قانون) ہے جس میں کبھی تغیر نہیں ہوتا۔ جماعت مومنین، اسی نفسیاتی تبدیلی کا مظہر ہوتی ہے اور یہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے اس قرآن پر صحیح ایمان سے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

ایک چیز ہے اسلام کی دعوت کا فکری طور پر سمجھنا اور اس طرح ذہنی طور پر اس کی صداقت کا معترف ہو جانا۔ اس کا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دماغ میں اس دعوت کے متعلق شکوک و شبہات پیدا نہیں ہوتے اور اس کے خلاف منطقی دلائل اور فلسفیانہ اعتراضات اسے ڈگمگا نہیں دیتے۔ لیکن ایمان کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے، جب کہ دعوت کے کسی تقاضے (یعنی مستقل قدر) اور انسان کی طبیعی زندگی کے کسی تقاضے میں (خواہ وہ محض جذباتی بات ہو یا محسوس مفاد کا سوال) تصادم ہو اور وہ طبیعی زندگی کے تقاضے پر مستقل قدر کے تقاضے کو ترجیح دے۔ یہ ہے وہ ایمان جو دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوتی ہے۔ اسی کے حاملین کو مومن کہتے ہیں جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝ (۲/۱۵۷)۔

میں اس حقیقت کو پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ ابھی ابھی کہا ہے اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن کریم نے مومن اور مسلم میں مستقل طور پر یہ تفریق کی ہے۔ بالکل نہیں۔ اس نے مومن اور مسلم کے الفاظ مرادف معنوں میں استعمال کئے ہیں اور مومنوں کی عظیم ترین شخصیتوں ---- حتیٰ کہ حضرات انبیاء کرامؑ مع جملہ نبی اکرمؐ ۔ کو مسلم کہہ کر پکارا ہے۔ اس نے فرق یہ بتایا ہے کہ جو لوگ کسی مصلحت کی خاطر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں انہیں اپنے آپ کو مومن نہیں کہنا چاہیئے تا آنکہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست نہ ہو جائے۔ ورنہ، عام معنوں میں، مومن کی طرح مسلم بھی وہ ہیں۔ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۱۱۲)۔ جس نے اپنی تمام خواہشات اور توجہات کو قوانین خداوندی کے تابع رکھا اور اس طرح نہایت متوازن زندگی بسر کی۔ سو اس کے اعمال کا اجر اس کے نشو و نما دینے والے کے پاس ہے۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ اسے نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن۔ لہٰذا مومن اور مسلم وہ ہے جسے نہ خارج سے کسی قسم کے خطرہ کا خوف ہو اور نہ داخلی طور پر اس کے دل میں یاس و حزن کا گزر ہو ---- یہ ہے مقامِ مومن اور اندازِ مسلم۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے

یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں!

نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری

نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں!

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی

یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں!

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال

عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوزِ دروں!